ایمان کی حقیقت

تصدیق بالقلب

مولانا بدر عالم میرٹھیؒ

تصدق قلبی کو ایمان کا وجودِ ذہنی کہا جاتا ہے۔ یہ تصدیق مختلف صورتوں میں پائی جاتی ہے:

۱۔ کبھی دلائل و براہین کا قاہرانہ تسلط یقین کرنے کے لیے مجبور کردیتا ہے۔

۲۔ کبھی انسان از خود دلائل و براہین کا دروازہ جھانک کر علم یقین تک رسائی حاصل کرلیتا ہے۔

۳۔ کبھی بلا وسائل و اسباب بداہتہً یقین میسر آجاتا ہے۔

۴۔ کبھی نہ دلائل کا شعور ہوتا ہے' نہ اور کوئی فطری احساس' صرف تقلیدی طور پر ایک اذعان پیدا ہو جاتا ہے۔

۵۔ کبھی شمشیر کی جھنکار حجابِ غفلت اٹھا دیتی ہے اور صداقت اسلام کا عکس پڑنے لگتا ہے۔

۶۔ کبھی جان و آبرو کی حفاظت کی طمع قلب کو تصدیق کرنے کے لیے ابھار دیتی ہے۔

تصدیق اور التزام اطاعت

ان سب صورتوں میں گو اختیاری یا اضطراری طور پر تصدیق تو حاصل ہو جاتی ہے مگر ایمان کا وجود ذہنی' اس وقت پھر بھی نہیں ہوتا جب کہ قلب اقرارِ وفاداری اور عہد فرمانبرداری نہ کرے۔ اسی کا نام انقیادِ باطن ہے۔ یہ علم نہیں' ایک عملِ قلب ہے اور اختیاری ہے۔ اسی لیے اس پر جزا و سزا مرتب ہے۔ اسی کو عقدِ قلبی سے تعبیر کیا گیا ہے۔

فقہا کی عبارات میں ضروری ہے کہ تصدیق سے اسی خاص نوع کا ارادہ کیا جائے یا اقرار سے مراد التزام طاعت لیا جائے' ورنہ تصدیق و اقرار کے دو لفظ مل کر بھی ایمان کا پورا مفہوم شرعی ادا کرنے کے لیے کافی نہیں ہیں۔ حافظ تیمیہؒ نے اپنی کتاب الایمان میں اس جز پر بہت زور دیا ہے۔ یہاں اعتراضات عام طور پر سینوں میں کھٹک رہے ہیں اور بہت سے قلم جواب کے لیے جنبش کرتے نظر آتے ہیں مگر تشفی بخش جواب صرف حافظ ابنِ تیمیہؒ کا ہے۔

انسان ایک ضعیف مخلوق ہے۔ کبھی ایسی جسارت کرلیتا ہے کہ تصدیق اس کو حاصل ہوتی ہے مگر اقرار نہیں کرتا۔ کبھی اس سے بڑھ کر یہ غضب ڈھاتا ہے کہ دل سے تصدیق اور زبان سے اقرار بھی کرلیتا ہے' مگر اس کو اپنا عقیدہ بنانے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔

قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَآ اَکْفَرَہٗ (عبس ۸۰ : ۱۷)

انسان مارا جائے' کس قدر ناشکرا ہے۔

ہرقل جیسے عالم کتاب کی تصدیق کا حال' اس کے اور ابو سفیان کے مکالمہ سے ظاہر ہے۔ اہل کتاب کی معرفت کا تذکرہ عام طور قرآن کریم نے بڑے وزنی الفاظ میں کیا ہے۔

یَعْرِفُوْنَہٗ کَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَھُمْ (البقرہ ۲ : ۱۴۶)

اس رسول کو اس طرح پہچانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کو۔

مگر بااین ہمہ ان کے کفر میں کسی کو مجال شبہ نہیں ہے --- ابو طالب کی داستانِ جاں نثاری سے کتبِ سِیَر کے صفحات مملو نظر آتے ہیں مگر یہاں بھی جمہور محققین ان کے کفر ہی کی طرف جا رہے ہیں۔

حضرت ابو طالب کا اسلام:

بعض اہل نظر کا یہ خیال ہے کہ جو بے نظیر جان نثاری جناب ابو طالب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں ظاہر فرمائی تھی' وہ یقیناً کبھی خالی جا نہیں سکتی۔ اس لیے ان کا رجحان ان کے اسلام کی طرف ہے۔ قائل کے ان جذبات محبت کا ہمیں بہت احترام ہے۔ مگر جن کے احترام کی خاطر یہ سارا احترام ہے' کیا کیجیے خود ان سے اس زبردست دعویٰ کی کوئی صحیح سند نہیں ملتی۔ اعلانِ حق کی ذمہ داری اس موقع پر کچھ وضاحت کی متقاضی ہے۔ مگر محل کی نزاکت خاموشی سے گزر جانا چاہتی ہے۔ اس گویائی اور خاموشی کے مابین ایک مصنف کا متحیر قلم جو کچھ لکھ سکتا ہے' وہ صرف اس قدر ہے کہ رب العزت کی بلند بارگاہ ہے جہاں کسی کی عداوت و جان نثاری دونوں سے بے نیازی حاصل ہے۔

زمانہ جاہلیت میں عمر فاروقؓ کی شمشیر ایک بدترین ارادہ کے لیے بے نیام ہوتی ہے' مگر شانِ بے نیازی ان پر سعادت کا دروازہ کھول دیتی ہے۔ ادھر جناب ابو طالب کی جاں نثاری دیر سے دروازہ کھٹکھٹا رہی ہے' مگر شانِ استغفار التفات تک نہیں کرتی' اور یہ کہہ کر دروازہ بند کر دیتی ہے کہ فَرِيقٌ فِي الْجَنَّةِ وَفَرِيقٌ فِي السَّعِيرِ (الشوریٰ ۴۲ : ۷)

کتبِ احادیث کے مطالعہ کرنے والوں کو حیرت ہے کہ بعینہٖ یہ سوال جب حضرت رسالتؐ سے بہت پہلے کیا جا چکا ہے اور اس کا جواب بھی خود زبان فیض ترجمان سے صادر ہو چکا ہے تو پھر اس کے بعد بھی قیاس آرائی کا کیا کوئی موقعہ باقی رہ جاتا ہے؟

صحیح بخاری و مسلم میں ہے کہ ایک مرتبہ آپؐ سے دریافت کیا گیا کہ 'یا رسول اللہؐ آپؐ نے اپنے چچا کو کیا نفع پہنچایا۔ وہ آپؐ کے لیے ہمیشہ سربکف رہا کرتے تھے۔ آپؐ نے جواب دیا کہ میری وجہ سے ہی ان کے عذاب میں اتنی تخفیف کر دی گئی ہے کہ صرف آگ کے دو جوتے پہنا دیے گئے ہیں' جن کی تیزی سے ان کا دماغ کھول رہا ہے۔ اگر میں نہ ہوتا تو جہنم کے سب سے نیچے طبقے میں ہوتے۔

یہ بحث ابھی نہیں ہے کہ یہ جاں نثاری رسول خداؐ کے لیے تھی یا ایک عم کی اپنے ابن عم کے لیے۔ انصار کی محبت' اس لیے کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نصرت کی' ایمان کی علامت ہے اور اسی حیثیت سے ان سے بغض' نفاق کی نشانی ہے۔ اگر یہ حیثیت ملحوظ نہ رہے تو نہ وہ ایمان کی علامت ہے اور نہ یہ نفاق کی۔

۔ کتاب الایمان ص ۷۷ ۔ ایضاً ۱۰۶

ان سب امور سے یہی نتیجہ پیدا ہوتا ہے کہ جب تک تصدیق کے ساتھ التزام طاعت اور انقیادِ قلبی نہ ہو' ایمان حاصل نہیں ہوتا۔ ہرقل اور اس جیسے اور اہلِ کتاب نے تصدیق ضرور کی' اور اقرار بھی کیا' مگر کیا ایک لمحہ کے لیے بھی' اپنا قدیم مذہب ترک کر کے دینِ محمدی میں قدم رکھا؟ جناب ابو طالب نے جاں نثاری کا جو نقشہ پیش کیا' بلاشبہ وہ رہتی دنیا تک تاریخ کے صفحات کی زینت رہے گا۔ مگر کیا ایک مرتبہ بھی' اس کلمہ کے لیے' ان کی زبان متحرک ہوئی جس کے لیے رسول خداؐ دیر سے اصرار فرما رہے تھے۔

انقیادِ باطن' التزامِ طاعت اور عہدِ وفاداری' یہ وہ اوصاف ہیں جن کے بغیر تصدیق صرف علم ہی کا اک مرتبہ رہتا ہے۔ ایمان کے وجودِ ذہنی کے لیے ضروری ہے کہ یہ علم ایسی صفتِ نفس بن جائے کہ پھر قلب اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دینے پر مجبور ہو جائے۔ اسی کا نام ہم نے عملِ قلب رکھا ہے۔ بعض ضعیف الاسناد روایات میں ایمان کی تعریف میں "عقد بالقلب" کا لفظ وارد ہے۔ اسی طرح عباراتِ سلف میں بھی یہ لفظ پایا جاتا ہے۔ ہمارے

نزدیک اس کی مراد بھی یہی عملِ قلب ہے۔

خلاصہ یہ کہ ایمان صرف تصدیق نہیں ہے' بلکہ انقیاد قلبی اور التزام بھی اس کا اہم جز ہے۔ اگر ایک شخص صرف تصدیق رکھتا ہے مگر عہدِ وفاداری نہیں کرتا' وہ مومن نہیں کہلا سکتا۔ اسی طرح اگر فرمانبرداری کے لیے تو آمادہ ہے' مگر قلب و زبان سے تصدیق کے لیے آمادہ نہیں' تو بھی وہ مومن نہیں ہے۔ ایمان صرف اس صورت کا نام ہے کہ قلب و زبان تصدیق سے مزیّن ہوں' اور شریعت پر عمل پیرا ہونے کا عزم بھی مصمم ہو۔ گویا شرعی تصدیق اسی کا نام ہے۔

تصدیق کا حقیقی مفہوم

شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ" فرماتے ہیں کہ قرآن و حدیث کے جو الفاظ خود شارع علیہ السلام کے بیان اور محل استعمالات سے کسی معنی کے لیے متعین ہو چکے ہیں' بس وہی اس کے صحیح معنی ہوں گے۔ لغت میں عموم یا خصوص اس کے معنی پر کچھ اثر انداز نہ ہو گا۔ ایک متکلم جب اپنے بار بار کے استعمال سے ایک لفظ کے معنی خود متعین کر دیتا ہے تو پھر کسی کو حق نہیں رہتا کہ لغت کی مدد یا دیگر شواہد سے اس کے کلام میں کوئی دوسرے معنی مراد لے۔ مثلاً یہی ایمان کا لفظ لے لیجیے۔ لغت میں یہ لفظ تصدیق کے لیے موضوع ہے مگر شارع علیہ السلام نے اس لفظ کو جب بھی استعمال کیا ہے' ایک خاص نوع کی تصدیق کے لیے ہی استعمال کیا ہے۔ اس لیے اب احادیث میں اس لفظ سے وہی تصدیق مراد لی جائے گی' جو اس کے مکرر سہ کرر بیانات سے متعین ہو چکی ہے۔ فرض کرو' ایک شخص دربارِ نبوت میں حاضر ہوتا ہے اور تصدیق کے ساتھ یہ بھی کہتا ہے کہ میں' نہ آپ کے احکام بجا لاؤں گا' نہ جس چیز سے آپ منع فرمائیں گے باز رہوں گا' نہ فرائض خمسہ ادا کروں گا۔ ہاں' شراب پیوں گا' چوری' زنا' نکاح محارم کروں گا۔ غرض جو ناکردنی ہے وہ سب کچھ کروں گا۔ کیا ایک لمحہ کے لیے بھی کوئی شخص یہ تصور کر سکتا ہے کہ محض لغوی تصدیق کے بعد رسول خدا اس کے لیے ایمان کا پروانہ تحریر فرما دیں گے' اس کی شفاعت کا وعدہ فرمالیں گے اور جہنم سے نجات ابدی کی بشارت سنا دیں گے۔ یا یہ جواب دیں گے کہ تو صرف کافر نہیں بلکہ بدترین کافر ہے۔ تیرا یہ ایمان' ایمان نہیں' استہزا ہے۔ یہ تصدیق نہیں' بلکہ تکذیب کا بدترین مظاہرہ ہے اور اگر یہ بھی ایمان ہے تو پھر ابلیس کے ایمان میں کیا کسر تھی' جس نے صرف ایک ہی سجدہ کا تو انکار کیا تھا۔ پھر قرآن نے کیوں اس کو کافروں میں شمار کر لیا ہے۔ وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ (البقرہ ۲:۳۴)

حضرت استاد مولانا انور شاہ کشمیریؒ فرماتے تھے کہ ایمان کا ترجمہ جاننا' یا یقین کرنا' یا تصدیق کرنا اچھا نہیں ہے۔ ان تراجم سے ایمان کی پوری حقیقت واضح نہیں ہوتی۔ صحیح ترجمہ "ماننا" ہے جس سے التزام طاعت کا مفہوم بھی ادا ہو جاتا ہے۔ شاعر کہتا ہے۔

اتنی ہی تو بس کسر ہے تم میں   کہنا نہیں مانتے کسی کا

اردو داں حضرات کو حضرت استاد کا ایک ترجمہ ہماری اس ساری تفصیل سے بے نیاز کر سکتا ہے۔ یہ ہے ایمان کا وجودِ ذہنی۔ یہی ایمان کا جزاشرف ہے' نجات ابدی اسی پر منحصر ہے اور آخرت کی ساری خوشیاں اسی کے ثمرات و برکات ہیں۔

تصدیق کے باوجود اِنکار

اگر یہ شبہ کیا جائے کہ تصدیق و معرفت حاصل ہونے کے بعد اِنکار و جحُود کیسے ممکن ہے' تو اس کا جواب یہ ہے کہ ایک انسان تکمیل انسانیت سے پہلے انسان نہیں بنتا وہ ہمیشہ خصائل بجیہ کا محکوم بنا رہتا ہے۔ اس کے علوم و معارف میں اتنی طاقت نہیں ہوتی کہ وہ اپنے فطری و خلقی جذبات کو شکست دے سکے۔ وہ جانتا ہے کہ اس کی راحت ابدی صرف انبیا کی اطاعت میں منحصر ہے' مگر اس کے ساتھ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ ایمان لانا بہت سے لذائذ و مرغوبات کا ترک کردینا' اور بہت سے مکروہات میں اپنی جان کو مبتلا کر دینا ہے۔ اس لیے قیدِ ایمان کی لذت سے یہ نا آشنا' اپنے ہاتھ سے اپنے بازوئے آزادی کترتے ہوئے کبھی اتراتا اور کبھی کتراتا ہے۔ اِبلیس کے علم و تصدیق کا حال تو مشہور ہی ہے۔ فرعون کی تصدیق کا حال حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبانی سن لو۔

لَقَدْ عَلِمْتَ مَآ اَنْزَلَ هٰٓؤُلَآءِ اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ بَصَآئِرَ (بنی اسرائیل ۱۷: ۱۰۲)

آپ جان چکے ہیں کہ یہ چیزیں کسی نے نہیں اتاریں مگر آسمان و زمین کے مالک نے' سمجھانے کے واسطے۔

معلوم ہوا کہ فرعون جیسا شقی بھی نزولِ آیات کے منشا کا صحیح علم رکھتا تھا' مگر اس کے بعد بھی جو کفر اس نے کیا ہے کیا دنیا میں ضرب المثل نہیں؟ اس کی وجہ بے علمی تھی ؟ یا سارے جہان پر اس کا علوو برتری کا جنوں۔

اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِی الْاَرْضِ وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا (القصص ۲۸: ۴)

فرعون ملک میں بڑائی کر رہا تھا اور وہاں کے لوگوں کو پارٹیاں بنا رکھا تھا۔

اِذْهَبْ اِلٰی فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰی (النازعات ۷۹: ۱۷)

فرعون کی طرف جاؤ اس نے بہت سر اٹھایا ہے۔

اکثر کفار اسی طغیان کے شکار تھے۔ اور یہی وجہ ہے کہ جو بکواس انھوں نے نبیؐ وقت کے بالمقابل کبھی کی ہے، اس میں ایک حرف بھی ایسا پیش نہیں کیا جس کو ایک صحیح الدماغ انسان ایک منٹ کے لیے نبوت کے منافی سمجھ سکتا ہو۔ صرف اپنے حسد و بغض کا مظاہرہ کیا ہے اور بس۔ معلوم ہوا کہ اپنی جگہ ان کی نبوتوں میں کفار کو بھی شبہ نہ تھا، ورنہ کبھی ایک دلیل تو ایسی بیان کرتے جو ان کفر یا تردد کی کچھ تو پردہ پوشی کر لیتی۔ آیات ذیل کا بغور ملاحظہ کرو اور فیصلہ کرو۔ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کہتی ہے۔

أَنُؤْمِنُ لَكَ وَاتَّبَعَكَ الْأَرْذَلُونَ (الشعراء ۲۶: ۱۱۱)

کیا ہم تیری فرمانبرداری کریں حالانکہ تیری پیروی تو ذلیل لوگوں نے کی ہے۔

کیا اِتباعِ ارذلین بھی صدقِ نبی کے منافی ہے یا کذبِ نبی کی کوئی دلیل بن سکتی ہے۔ ہرگز نہیں۔ بات یہ تھی کہ متکبر اور مغرور انسان کبھی یہ پسند نہیں کر سکتا کہ ایک کمزور اور ذلیل انسان کو اپنے برابر یا اپنے نفس کو اس کے پہلو بہ پہلو، دیکھ سکے، اور یہ وہ خوب جانتا ہے کہ اسلام اس کے اس فاسد جذبہ کو، ہرگز پورا نہیں کر سکتا۔ وہ اس فرق کو اٹھا دینے کے لیے آیا ہے۔ یہی تو وجہ تھی کہ مشرکین عرب نے بھی سرور کائناتؐ کے سامنے یہ درخواست پیش کی کہ سعد بن ابی وقاص، ابن مسعود، خباب بن الارت، عمار بن یاسر، بلال رضی اللہ تعالیٰ عنھم اور ان جیسے اور غربا کو اپنی محفل سے نکال دیجیے تاکہ ہمارے آنے جانے کی جگہ ہو جائے۔ اس پر قرآن کریم نے جو جواب دیا، وہ یہ تھا۔

وَلَا تَطْرُدِ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُم بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ وَجْهَهُ مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِم مِّن شَيْءٍ وَمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِم مِّن شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُونَ مِنَ الظَّالِمِينَ ○ وَكَذَٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لِّيَقُولُوا أَهَٰؤُلَاءِ مَنَّ اللَّهُ عَلَيْهِم مِّن بَيْنِنَا أَلَيْسَ اللَّهُ بِأَعْلَمَ بِالشَّاكِرِينَ ○ (الانعام ۶: ۵۳)

اور مت دور کیجیے ان لوگوں جو پکارتے ہیں اپنے رب کو صبح اور شام، چاہتے ہیں اس کی رضا آپ پر، ان کے حساب میں کچھ نہیں ہے اور نہ آپ کے حساب میں ہی ان پر کچھ ہے کہ آپ ان کو دور کرنے لگیں تو بے انصافوں میں ہو جائیں۔ اور اسی طرح ہم نے آزمایا ہے بعضے لوگوں کو، بعضوں سے، تاکہ کہیں، کیا یہی لوگ ہیں جن پر اللہ نے فضل کیا ہم سب میں۔ کیا اللہ تعالیٰ شکر کرنے والوں کو خوب جاننے والا نہیں ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کا مغرورانہ جواب

اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا وَقَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ ۝ (المومنون ۲۳: ۴۷)
کیا ہم ایمان لائیں ایسے دو آدمیوں پر جو ہم جیسے ہیں' اور ان کی قوم ہماری تابعدار ہے۔

اَلَمْ نُرَبِّكَ فِيْنَا وَلِيْدًا وَّلَبِثْتَ فِيْنَا مِنْ عُمُرِكَ سِنِيْنَ ۝ وَفَعَلْتَ فَعْلَتَكَ الَّتِيْ فَعَلْتَ وَاَنْتَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ (الشعراء ۲۶: ۱۹)
کیا نہیں پالا ہم نے تجھ کو اپنے یہاں لڑکا سا' اور رہا تو ہم میں اپنی عمر میں سے کئی برس۔

حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم کی متمردانہ تقریر
اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا (ھود ۱۱: ۸۷)
کیا تجھے تیری نماز اس بات کا حکم دیتی ہے کہ ہم ان بتوں کی عبادت ترک کر دیں جن کی عبادت ہمارے باپ دادے کیا کرتے تھے' یا اپنے مال میں جس طرح چاہیں تصرف کریں۔

مشرکینِ عرب کا ایک لغو اعتراض
لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ ۝ (زخرف ۴۳ - ۳۱)
یہ قرآن ان دو بستیوں کے کسی شخص پر کیوں نہ اتارا گیا۔
ان بیانات کو پڑھ کر کیا آپ نے یہ نتیجہ نکالا کہ ان کفار کو سچ مچ' ان انبیا کے متعلق' کوئی شبہ درپیش تھا۔ کیا ان بیانات میں ان کے صدق و کذب پر کوئی بحث ہے' یا محض اپنے حسد و بغض کی ترجمانی ہے۔
مشرکینِ عرب کا ایک بے معنی عذر
اِنْ نَّتَّبِعِ الْهُدٰى مَعَكَ نُتَخَطَّفْ مِنْ اَرْضِنَا (القصص ۲۸: ۵۷)
اگر ہم راہ پر آ جائیں تیرے ساتھ' تو اچک لیے جائیں اپنے ملک سے۔
دوسری جگہ کہتے ہیں۔
اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ ۝ (زخرف ۴۳: ۲۲)
ہم نے اپنے باپ دادوں کو ایک راہ پر پایا اور اب ہم انھی کے مقتدی رہیں گے۔
کیا یہ ہیں وہ دلائل جو کسی رسول کی صداقت کے منافی ہو سکتے ہیں۔

حافظ ابن تیمیہ ؒ یہ سب کچھ لکھ کر فرماتے ہیں کہ جناب ابو طالب کی محرومی کا باعث ان باتوں میں سے کوئی بات نہ تھی۔ وہ تو بدل و جان آپ کے لائے ہوئے دین کی برتری کے لیے ہمیشہ کوشاں رہے۔ مگر تقدید یہاں دوسرے راستہ سے آئی۔ یعنی آبائی دین کے ترک پر قریش کا طعنہ ان سے برداشت نہ ہو سکا۔ تصدیق موجود ہے' معرفت تامہ حاصل ہے' قدم قدم پر جاں نثاری ہو رہی ہے۔ یہ سب کچھ ہے' مگر التزام طاعت کا ابھی ارادہ نہیں ہے۔ کیوں؟ تقدیر' عصبیت جاہلیت' قومی غیرت اور مذہبی جمود کی صورت میں نمودار ہوتی ہے اور آغوش اسلام میں آنے نہیں دیتے۔

ان سب امور کے سوا ذلیل طبع افراد کے سامنے کبھی معمولی سے نفع و ضرر کا سوال بھی آ جاتا ہے۔ اس لیے مقتضائے تصدیق پورا نہیں ہوتا۔

فَتَرَى الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يُّسَارِعُوْنَ فِيْهِمْ يَقُوْلُوْنَ نَخْشٰۤى اَنْ تُصِيْبَنَا دَآئِرَةٌ ؕ فَعَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَ بِالْفَتْحِ اَوْ اَمْرٍ مِّنْ عِنْدِهٖ فَيُصْبِحُوْا عَلٰى مَاۤ اَسَرُّوْا فِيْۤ اَنْفُسِهِمْ نٰدِمِيْنَ۔ (مائدہ ۵ : ۵۲)

آپ دیکھیے گا ان کو جن کے دل میں بیماری ہے۔ ان میں دوڑ کر ملتے ہیں کہتے ہیں کہ ہم کو ڈر ہے کہ ہم پر زمانہ کی گردش نہ آ جائے' سو قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ جلد ہی فتح ظاہر فرما دے یا کوئی حکم اپنے پاس سے بھیجے تو اپنے دل کی (ان) پوشیدہ باتوں پر پچھتانے لگیں۔

ان تمام تفاصیل سے یہ ظاہر ہو گیا کہ بسا اوقات تصدیق قلبی میسر آ جاتی ہے' مگر انسان کی طبعی غیرت' یا قومی عصبیت و نخوت' یا عزت و مال کی تھوڑی سی طمع' اور اسی قسم کے دوسرے موانع باطنی' انقیاد اور التزام طاعت سے مانع رہتے ہیں۔ نعوذ باللہ من شر الشیطان و شرکہ۔

تصدیق اور احکام شریعت

یہ ملحوظ رہنا چاہیے کہ تصدیق و انقیاد کا دائرہ صرف ذات و صفات کے مسائل یا رسالت کی حد تک محدود نہیں ہے' بلکہ رسول کا ہر قول اور ایک ایک اشارہ اس میں شامل ہے' ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً (بقرہ ۲ : ۲۰۸)

اے ایمان والو' داخل ہو جاؤ اسلام میں پورے۔

حضرت مجاہدؒ اور قتادہؒ فرماتے ہیں کہ یہ آیت مسلمانوں کو' شریعت کے ہر ہر جز پر التزام طاعت کی' دعوت دیتی ہے' خواہ وہ فرائض ہوں یا مستحبات' واجب علی الکفایہ ہوں

یا علی الاعیان۔ اگر اسلام کے فرائض علی الاعیان ہیں تو اعتقاد فرضیت کے ساتھ ہر ہر شخص پر اس کا ادا کرنا بھی فرض ہو گا' اور اگر واجب علی الکفایہ ہیں تو اس کے وجود کا اعتقاد ضروری ہو گا' اور اگر مستحبات ہیں تو اس کا اعتقاد لازم ہو گا۔ غرض یہ کہ جس چیز کا دین محمدی میں داخل ہونا بداہتہً معلوم ہو چکا ہے' وہ سب ایمانیات میں داخل ہیں۔ اور کیوں نہ ہوں؟ کیا ایمان' رسولِ خدا کی مطلقاً فرمانبرداری کا نام نہیں؟ کیا التزامِ طاعت میں کوئی تفصیل ہے؟ اگر رسولؐ کا فرمان اس لیے واجب العمل ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا پیغمبر ہے' جو کہتا ہے وہ حق ہی کہتا ہے' تو پھر انقیاد و تسلیم کا دائرہ اس کے سب اوامر و نواہی پر کیوں محیط نہ ہو۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ زمانہ رسالت میں چونکہ واسطے نہ تھے' ہر بات براہِ راست سنی جاتی اور دریافت کی جاتی تھی اور اگر واسطے تھے بھی تب بھی اس کی تحقیق بلا واسطہ ممکن تھی' اس لیے التزامِ طاعت بلا استثنا لازم تھا۔ لیکن بعد میں سند کا طویل سلسلہ حائل ہو گیا۔ جرح و تعدیل کے بے شمار مباحث نے احادیث میں ضعیف و قوی کی تقسیم پیدا کر دی۔ اس لیے اب یہ بحث قائم ہو گئی کہ کن چیزوں پر ایمان لانا ضروری ہے' اور کیا چیزیں ایمانیات میں داخل نہیں۔ جواب اب بھی وہی ہے۔ یعنی جو فرمان رسولؐ ہے اس سب کا ماننا فرض ہے۔ مگر اب اس کا ثبوت کیا ہے کہ یہ بات درحقیقت رسول خدا کی فرمودہ بھی ہے۔ اس لیے علما نے یہ فیصلہ کر دیا ہے' کہ جس چیز کا دین محمدی میں ہونا اتنا روشن ہو جائے کہ محتاجِ دلیل نہ رہے' ان سب کا ماننا ایمان کے لیے ضروری ہے اسی کو ضروریاتِ دین کہا جاتا ہے۔ مثلاً فرائضِ خمسہ' زکوٰۃ' حج' روزہ' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خاتم النبیین ہونا' آپ کے بعد کوئی دوسرا نبی نہ ہونا' عذابِ قبر' قیامت' قرآنِ کریم وغیرہ۔ یہ سب وہ چیزیں ہیں جس کے ثبوت میں دلائل کی حاجت نہیں بلکہ کفار بھی ان چیزوں کا دین میں داخل ہونا جانتے پہچانتے ہیں۔ اس لیے اس کا انکار' اسی طرح کفر ہو گا جیسا کہ توحید یا رسالت کا۔